# سامی اقوام کے ابتدائی مسکن، زبان اور تہذیب کا جائزہ

# Early Habitates, Languages and Cultures of Sematic Tribes: An Analysis

* مفتی محمد التماس خان


## Abstract

*This article comprises of a summary of the sematic nations. Originally sematic tribes are associated to the elder son of the Prophet Noah (peace be upon him) who had settled themselves between the eastern coast of Mideternain Sea and Persian Gulf prior to 3000 BC. This article highlights the details about the locations, languages, beliefs, civilizations and cultures of the sematic nations of this area. The article also discusses three living religions - Judaism, Christianity and Islam – also termed as Abrahamic faiths, belonging to the sematic race with great patriarch Ibrāhīm (peace be upon him) as their ancestor.*


**Keywords**: Sematic Tribes, Mideternain Sea, Persian Gulf, First dwelling place, Languages, Culture

### سامی نام کا وجہ تسمیہ:

بائبل کے مطابق سام حضرت نوحؑ کے بڑے بیٹے تھے جس کی نسل بحر متوسط، دریائے فرات، دریائے دجلہ کی وادیوں اور جزیرۂ عرب کے صحراؤں اور بحر احمر کے جنوب مشرقی اور بحیرہ عرب وہند کے مغربی خطوں میں سکونت اختیار کر چکی تھی[1]۔

اس حوالے سے علماء تاریخ کے ہاں آرامی، فینیقی، عبرانی، عربی، یمنی، بابلی اور عاشوری آبادیوں پر سامی لقب کا اطلاق کیا جاتا ہے۔[2]
اس اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے مشہور جرمن مورخ[3] Schlozer نے کیا تھا۔[4] جبکہ دوسرے جرمن عالم[5] Eichhorn نے اٹھارہویں صدی عیسوی کے آواخر میں اس کی موافقت کی۔ جن نے ان آبادیوں کو سامی قوموں اور زبانوں کا نام دیا[6]۔

دراصل یہ نام کسی کا ایجاد کردہ نہیں، بلکہ یہ کتاب مقدس (تورات) کے اس حصے سے ماخوذ ہے جہاں یہ ذکر ہے کہ نوح علیہ السلام کے بیٹے سام، حام اور یافث تھے[7] اور روئے زمین پر موجودہ قبائل اور انسانی آبادی انہی کے نسل سے ہے۔[8]

### سامی قبائل کا مسکن اول:

سامی قبیلے باہمی افتراق سے پہلے ایک ہی اصل اور مبدأ سے تعلق رکھتیں تھیں اور یہ قبائل ایک انسانی اکائی کی صورت میں موجود تھے[9] اگرچہ اس بابت بہت سی متباین آراء سامنے آئی ہیں۔ لیکن مشہور فرانسیسی تاریخ دان ارنسٹ رینان [10] Ernest Renan اور جرمن مستشرق بروکلیمن [11] Brocklemonn کے مطابق سامی قبائل کا پہلا وطن جزیرہ نما عرب کا جنوب مغربی حصہ ہے۔[12] عرب کے بعض قبائل ۳۰۰۰ ق م سے مسلسل ہجرتیں کر رہے تھے اور بلاد عراق کے جنوبی حصے میں آ کر آباد ہوئے تھے[13]

قدیم تاریخ سے بھی ہمیں یہی معلوم ہوتا ہے کہ دو ہزار سال ق م عراق (بابل)، شام اور مصر کے علاقوں پر سامی قومیں حکمران تھیں۔ جبکہ سامیوں کا اصل وطن جزیرۃ العرب تھا۔ لیکن مختلف اوقات میں انھوں نے دوسرے علاقوں کی طرف ہجرت کی۔

*لیکچرر، شعبہ علوم اسلامیہ، یونیورسٹی آف پشاور۔

ابن قتیبہ نے لکھا ہے:

"ارم بن سام کی نسل سے عمالیق ہیں۔ یہ لوگ مختلف علاقوں میں پھیل گئے تھے۔ مصر کے فراعنہ اور بابل کے جبابرہ انہیں میں سے تھے"[14]

بابل کی جانب عربوں کی ہجرت دو طرح سے تھی۔ ایک سست رفتاری کے ساتھ اور دوسری کافی سرعت کے ساتھ اور بڑی تعداد میں۔ پہلی قسم کی ہجرتیں تو ہر زمانے میں ہوتی رہیں۔ لیکن دوسری قسم کی ہجرتیں بعض بڑے حادثات کے نتیجے میں ہوئیں۔ ان کی پہلی ہجرت کا تذکرہ قدیم تاریخ میں یوں ملتا ہے کہ سامیوں کا ایک قبیلہ جس کا نام کلدہ تھا، اس نے آکر دجلہ اور فرات کے درمیانی علاقہ میں پڑاو ڈالا۔ اس کی ہجرت کا زمانہ تو معلوم نہیں ہے لیکن یہ ثابت ہے کہ ۳۶۰۰ ق م میں اس علاقہ میں ان کے تمدن کو عروج حاصل تھا۔ عراق کی جانب سامیوں کی ہجرت کی دوسری لہر ۲۵۰۰ ق م کے آس پاس میں آئی۔[15]

سامی اقوام زمانہ قدیم میں بابل سے ہوتے ہوئے شام تک پہنچ گئی تھیں۔ شام کے علاقوں میں ان کی موجودگی کا قدیم ترین ثبوت "اشوری تحریریں" ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہاں وہ ان تحریروں کے زمانے سے بہت پہلے پہنچ گئے تھے۔ اس لیے یہ علاقے جزیرۃ العرب کا تسلسل تھے اور وہاں کے باشندے ان علاقوں میں بلاروک ٹوک پوری آزادی سے آجاسکتے تھے۔

ڈاکٹر کرد علی نے لکھا ہے:

"شام میں عرب طویل عرصے سے رہائش پذیر تھے۔ صحیح قول کے مطابق ان کی موجودگی وہاں تقریباً ۲۵۰۰ ق م سے ہے۔ بعض لوگوں نے یہ زمانہ تقریباً ۴۰۰۰ ق م بتایا ہے۔ دوسری قدیم قومیں بھی انہیں کی تہذیب میں ڈھل گئی تھیں"[16]

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شام میں تقریباً ۵۰۰۰ ق م سے فینیقی آباد تھے۔ یہ لوگ بھی عرب تھے۔ ان کا اصل وطن خلیج فارس میں بحرین کا علاقہ تھا۔ شام میں ان کی مملکت کو کافی شہرت حاصل تھی۔[17]

رہا مصر تو وہاں بھی سامی اقوام زمانہ قدیم میں پہنچ گئی تھیں۔ ماضی قریب میں ہونے والی اثری تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ مصر میں لوہے کا زمانہ (IRON AGE) سامیوں کے وہاں پہنچنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ گویا اس سے قبل مصری لوہے کے ہتھیاروں سے واقف نہ تھے۔ زمانہ قدیم ہی سے سامیوں کے مصر پہنچ جانے کی ایک دلیل یہ ہے کہ مصریوں کا ایک قدیم ترین معبود "فتاح" سامی الاصل ہے۔

۲۰۰۰ ق م کے اوائل میں شام کے سامیوں نے مصر پر حملہ کیا اور اس کے سمندری علاقہ پر قابض ہو گئے۔ ان کا قبضہ اٹھارہویں صدی ق م تک قائم رہا۔ مصری انھیں "شاسو"، یونانی "ہیکسوس" اور عرب عمالقہ یا عرب بائدہ کے نام سے پکارتے تھے۔[18]

گزشتہ تفصیل سے واضح ہوا کہ ڈھائی ہزار سال قبل مسیح میں بابل، شام اور مصر میں سامی اقوام حکومت کر رہی تھیں۔

## سامی زبانیں:

سامی زبانیں عمومی طور پر ایسی خصوصیات پر مبنی ہیں جو ان کی اصل کے ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہیں، چنانچہ یہ زبانیں باقی تمام زبانوں سے اس امر میں ممتاز ہیں کہ ان کے الفاظ کا اصل اکثر و بیشتر تین ساکن اصوات (ض ر ب) سے مل کر بنتا ہے، جبکہ بعض علماء کا میلان یہ ہے کہ سامی کلمات ثنائی الاصول ہیں اور جو کلمات رباعی ہے ان کے ہاں وہ بھی اصلاً ثلاثی ہے چنانچہ وہ لفظ " دحرج" کو

"دحر" اور "درج" دو الگ الگ لفظوں کا مجموعہ قرار دیتے ہیں کیونکہ ان دونوں لفظوں کے معانی میں دور کرنے اور دفع کرنے کا عنصر پایا جاتا ہے۔[19]

اسی طرح لغات سامیہ کی ایک خصوصیات یہ بھی ہے کہ ان کے الفاظ اپنے حروف کی وساطت سے اپنے معانی اصلیہ پر دلالت کرتے ہیں۔

دوسری خصوصیت یہ کہ ساری زبانوں کے بعض کلمات کے مواد ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں البتہ حرکات وسکنات کے تبدل سے ان کے مختلف معانی آتے ہیں۔ جیسے لفظ "م ل ک" اس لفظ کو اگر لام کے فتح کے ساتھ پڑھا جائے تو "فرشتہ" کے معنی آتے ہیں اگر بکسر اللام پڑھا جائے تو بادشاہ اور اگر بسکون اللام پڑھا جائے تو سلطنت و بادشاہت کے معانی آتے ہیں، اسی طرح اگر لفظ کے حرف اول اور ثانی کے حرکات میں تبدیلی کرنے سے مزید معانی بھی اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

اگر ہم سامی زبانوں کے سلسلہ نسب کا جائزہ لینا چاہیں تو اس تحقیق میں ہمارے سامنے یہ عقدہ کھلتا ہے کہ اپنے اصل تیئں یہ زبانیں مندرجہ ذیل دو قسموں پر منقسم ہیں: مشرقی اور مغربی۔

**مشرقی سامی زبانیں :**

جس کے تحت بابلی اور آشوری زبانیں آتی ہیں ان کو جدید فقہاء لسانیات کے ہاں اکادی بھی کہا جاتا ہے بلاد آکاد (Akkad)[20] کی طرف نسبت کی وجہ سے، اور قدماء کے ہاں ان کو ارسینیہ یا مسماریہ کہا جاتا ہے، اس لیے کہ ان زبانوں کے بولنے والوں نے مختلف زاویوں والے خط مسمار کو سومری عوام سے سیکھا تھا۔ جب یہ لوگ بلاد عراق کے جنوبی حصے میں آکر آباد ہوئے تھے۔ یہ گمان کیا جاتا ہے کہ یہ وہ عربی قبائل تھے جو ۳۰۰۰ق م سے مسلسل ہجرتیں کر رہے تھے۔[21]

**مغربی سامی زبانیں:**

یہ دراصل دو قسم پر ہیں : شمالی اور جنوبی۔

شمالی زبانوں میں کنعانی اور آرامی زبانیں داخل ہیں جن کے بارے قدرِ تفصیل درج ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

**کنعانی :**

سب سے راجح قول کے مطابق یہ ان قبائل کی زبان ہے جو غالباً ۲۰۰۰ق م بلاد عرب کے جنوب مغربی حصے سے اتر کر فلسطین، شام اور بحر ابیض متوسط کے بعض جزیروں میں آکر آباد ہوئیں جن کے مندرجہ ذیل بولیاں بولی جاتی تھیں:

**اجریتی :**

یہ کنعانی زبان کی سب سے قدیم اور مشہور بولی ہے، ان کے نقوش ۱۹۲۶ء کو بحر متوسط کے شامی ساحل والے علاقے رأس شمر میں دریافت ہوئے تھے جن کو ۱۴۰۰ق م قدیم خیال کیا جاتا ہے۔ اسی اجریتی بولی سے عالم انسانی نے ابھری کتابت سیکھی۔

**قدیم کنعانی :**

اس بولی کے بعض مفردات ہمیں تل العمارنۃ (اخناتون کے عہد کا مصری دارالخلافہ) کے خطوط سے ملے ہیں۔ جو کہ اکادی زبان میں لکھے گئے ہیں اور اس دور کے فلسطین پر حکومت کرنے والے مصری حاکموں اور فرعونوں نے ایک دوسرے کو بھیجے تھے۔ اس کا تاریخی اندازہ (۱۳۵۸-۱۴۱۱ق م) ہے۔[22]

**المؤابی :**[23]

یہ مؤابین کا لہجہ ہے جو عہد قدیم کے بیان کے مطابق ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے لوط علیہ السلام کے نسل سے تھے ماہرین آثار قدیمہ کو ایسے نقوش ملے ہیں جو اسی لہجے کے تحت لکھے گئے ہیں جن کو مؤابین کے بادشاہ میشع کی ملکیت قرار دیے جاتے ہیں[24]۔ ان میں میشع اسرائیل بادشاہ کے خلاف اپنی فتح کو بیان کرتا ہے اور ان نقوش کی تاریخ 900ق م سے زیادہ پرانی نہیں۔

**فینیقی :**

اس زبان کے بارے میں معلومات ہم کو صرف چند نقوش اور بعض ان نقود کے ذریعے ہی باہم پہنچی ہیں جو فینیقی قبائل کے قدیم مواطن (صیدا، صور، جبیل Byblos) سے دریافت کیے گئے تھے۔ فینیقی لہجہ اپنے وطن اصلی سے نکل کر بحر متوسط کے پاس خصوصاً قرطاجنہ میں آکر مستقل طور پر ٹھہر گیا تھا قرطاجنہ کی مشہور بولی " پونیہ Punique) تھی، جو فینیقی ہی کی ذیلی شاخ تھی، البتہ پونیہ کی عمر 500ق م تک لکھی گئی تھی، لہذا اپنی اصل و منبع فینیقی سے زیادہ عمر گزار گئی، فینیقی زبان کے سب سے قدیم نقوش کی تاریخ نویں دسویں قرن قبل از میلادی کو لوٹتی ہے۔

**عبرانی :**

کنعانی بولیوں میں بالا طلاق یہ سب سے اہم ہے جو ہم تک تورات کے قدیم اسفار (چند نقوش اور پتھر کے تختیوں) کی وساطت سے پہنچی ہے بسا اوقات یہود کی تورات کی تلاوت کرنے سے اور بعض اور ادپڑھنے سے اندازے لگائے گئے ہیں یہاں یہ ذہن نشین رہے کہ عبرانی سے تورات کی عبرانی ہی مراد ہے جو آج کل کی جدید ادبی عبرانی سے اکثر وبیشتر مختلف ہے۔

یہی متذکرہ بالا بولیاں کہلاتی ہیں:۔ اجریتی، قدیم کنعانی، مؤابی، فینیقی اور عبرانی [25]

**آرامی :**

اس زبان کے چند آثار ونشانات آشوری اور بابلی قبائل کے حوالے سے حاصل کیے گئے ہیں جو ۱۲۰۰ سے ۱۴۰۰ق م کے درمیان جزیرہ عرب سے ہجرت کر کے بابل اور آشور میں آکر آباد ہوئے تھے۔ آرامی قبائل اپنی جوانی اور طاقت کے بل بوتے پر اس قابل تھے کہ وہ اپنی شمالی اور مشرقی بہن زبانوں پر غالب آسکے، چنانچہ وہ مشرق قریب میں عام بول چال کی زبان بن کر رہ گئی۔ اور ۳۰۰ سے ۶۵۰ء تک کے محدود زمانے میں بلاد عراق سے لے کر شام فلسطین اور قرب جوار میں اپنی اوج کمال تک پہنچی، اور چند ماہرین لسانیات ان علاقوں (جہاں یہ زبان رائج ہے) کی مسافت کا اندازہ چھ لاکھ مربع کلومیٹر کا لگایا ہے، لہذا یہ ضروری تھا کہ اس زبان کی مختلف ذیلی بولیاں بن جائیں، چنانچہ مشرقی بولیاں (جن میں عام رائج بولیاں بھی شامل ہیں) بلاد عراق میں رائج تھیں اور مغربی بولیاں شام، فلسطین اور جزیرہ سیناء میں عام تھیں۔[26]

**جنوبی سامی زبانیں:**

مغربی سامی زبانوں کا جنوبی حصہ دو عظیم زبانوں پر مشتمل تھا۔ جنوبی عربی اور شمالی عربی ۔

**جنوبی عربی:**

علماء لسانیات نے جنوبی عربی کو مختلف ناموں سے موسوم کیا ہے جیسے قدیمی یمنی، قحطانی جبکہ ان میں سے چند نے اس کو صبائی بھی کہا ہے۔ کیونکہ یہی بولی وہاں سب بولیوں پر غالب آکر عام رائج تھی، اس زبان کے رسم الخط اور تعبیری اسلوب کی طرف ہمیں

رہنمائی ان نقوش سے ملی ہے۔ جو بتوں، قبروں کے کتبوں، بڑے بڑے ستونوں، چٹانوں، ذبح خانوں، بڑے بڑے محلات اور نقود پر کندہ تھے۔ اور ان سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ عربی بنیادی طور پر فصیح عربی سے نحوی قواعد، صوتی مظاہر اور معنوی دلالات کے لحاظ مختلف ہے۔ جنوبی عربی کی اہم بولیاں چار ہیں: معینی، سبائی، حضرمی اور قتبانی۔[27]

**شمالی عربی:**

یہ بات ابھی تک معلوم نہیں کہ اس عربی کی ابتداء کہاں سے ہوئی تھی اور ابتدائی زمانوں میں اس نے کتنے مراحل طے کیے۔ اس کو دو قسموں پر تقسیم کیا جاتا ہے: بائدہ اور باقیہ۔

**بائدہ:** بادی سے ہے جس کا مطلب "ہلاک ہونے والا"[28] ہے اس کی نقوش کی قدامت پہلی صدی قبل مسیح سے زیادہ نہیں اور یہ بات بھی کسی سے مخفی نہیں کہ بائدہ عربی سے مراد اس قوم کی بولی ہے قبل از اسلام فنا ہو چکی تھی۔ اور عربی کے اصل مرکز نجد اور حجاز سے دوری کے باعث ان پر آرامی زبان کی چھاپ نمایاں تھی[29]۔

بائدہ عربی کی اہم بولیاں تین ہیں۔:

**ثمودیہ:**

جس کی نسبت قرآن میں قوم ثمود کی طرف ہے اور قرآن کریم نے ان کے مساکن کا ذکر کئی مواقع پر کیا ہے، اس بولی کے جتنے بھی مدون نقوش دریافت ہوئے وہ تیسری اور چوتھی صدی عیسوی کے ہیں ان نقوش کی تعداد سترہ سو تک ہے جو نجد و حجاز کے درمیانی علاقے، جزیرہ نما سینا اور دمشق کے قرب وجوار میں ملے تھے، خط مسند سے ماخوذ ایک خوبصورت اور مرتب خط میں لکھے گئے تھے جو اوپر سے نیچے کی طرف عمودی شکل میں تھا۔[30]

**صفویہ:**

یہ بولی "صفا" علاقے کی طرف منسوب ہے۔ اس بولی کے اکثر و بیشتر نقوش، صفا علاقے کے رتیلے ٹیلوں کے پاس واقع کوہ دروز کے مختلف مقامات پر پائے گئے تھے۔ مشہور جرمن مستشرق انولٹمان (Enno Litmann) کے مطابق اس بولی کے خط کی ثمودی خط کے ساتھ قریبی مشابہت ہے۔[31]

**لحیانی:**

یہ بولی لحیان قبائل کی طرف منسوب ہے۔ جو حجاز کے شمال میں قبل مسیح آباد تھے۔ ان کا زمانہ ۲۰۰۔۴۰۰ ق م کے درمیان ہے۔
ثمودیہ، صفویہ اور لحانیہ یہ تینوں بولیاں (باجود اس کے کہ ہم تک ایسے نقوش کی وساطت سے پہنچی ہے جو کثرت کے باوجود کم اہمیت کے حامل ہیں) دو جہتوں سے ممتاز ہیں۔

1. یہ بائدہ عربی کے وہ لہجات ہیں جن کو فصیح عربی سے بہت زیادہ مشابہت ہے۔
2. جس خط سے ان بولیوں کی تدوین کی گئی ہے اس کے بارے میں یہ خیال بے جا نہ ہو گا کہ وہ فصیح عربی کے خط کی ترقی اور پھیلاؤ کا مرحلہ اولی ہے[32]۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسے نقوش بھی دریافت ہوئے ہیں جن کی روشنی میں بائدہ عربی اور باقیہ عربی کے درمیان باوجوہ یگانگت پائی جاتی ہے۔[33]

**باقیہ:**

اس کے نقوش پانچویں صدی میلادی سے پرانے نہیں۔ اس عربی سے مراد وہ زبان ہیں جس کو ہم آج بھی کتابت، تالیف اور ادب کے لئے استعمال میں لاتے ہیں اور یہی عربی ہی ہم تک قرآن وحدیث اور شعر جاہلی کے ذریعے پہنچی ہے۔

متذکرہ بالا بحث و تمحیص کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے ۔ کہ سامی زبانوں کا باہمی رشتہ انتہائی مضبوط تھا۔ سب زبانیں ایک دوسرے کے قریب علاقوں میں موجود تھیں جو وقت کے بدلنے سے اپنے علاقوں سے نہ نکلی، اور عراق میں آشوری و بابلی سے لے کر جزیرۂ عرب کے شمالی عرب تک ان پر مشرقی رنگ غالب تھا۔ اور یہ زبانیں مشرقی روایات کی حامل تھیں اور یہ بھی واضح ہے کہ کنعانی اور عبرانی، فلسطین وشام اور بحر ابیض کے جزائر میں پروان چڑھی اور آرامی اور سریانی نے عراق، شام اور فلسطین میں اپنی طبعی مدت پوری کی۔ نیز یہ بھی واضح ہوگیا کہ یہ زمانی ومکانی قربت اس بات کی قطعی دلیل ہے۔ کہ عرب زبان سامی زبانوں کے خاندان ہی ایک شاخ ہے اور ان کا آپس میں اصل وفرع کا رشتہ ہے۔ جس کا انکار کوئی متعصب ہی کر سکتا ہے۔

**علوم وفنون اور تہذیب وتمدن:**

بابل ایک بڑا تجارتی مرکز تھا۔ وہاں دور دراز مقامات سے تجارتی سامان آتا اور اسی طرح دور دراز ملکوں میں بھیجا جاتا تھا۔ بیان کیا گیا ہے کہ "اُر" کے تاجروں کی ایک جماعت ۲۰۰۰ ق م کے قریب بحرین سے تجارت کرتی تھی۔ اس مقصد سے اس نے ایک بحری بیڑا تیار کر رکھا تھا۔ بحرین کے جزیرہ تلمون کو بھی ایک اہم تجارتی مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ وہاں عمان سے قیمتی حجریات اور ہندوستان سے سونا، لکڑیاں، خوشبوجات اور دوسرے قیمتی سامان آتے تھے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۲۰۰ اور ۲۱۰۰ ق م کے درمیانی عرصے میں "ار" کے باشندوں کی کشتیاں اس سامان کو عراق لانے کیلئے مستقل حرکت میں رہتی تھیں اور وہاں سے شام اور شام سے بحر متوسط تک پہنچاتی تھیں۔ [34]

اہل بابل علم نجوم میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ستارے معبودوں کے ارادے کی خبر دیتے ہیں۔ ان کے ذریعے خوش بختی اور نحوست کا پتا لگایا جا سکتا ہے۔ وہ ان ستاروں کی حرکات کے ذریعے سے آندھی، بارش، طوفان، سیلاب، پیداوار اور بادشاہوں کی فتح وشکست کا پتہ لگاتے تھے۔ کوئی بچہ پیدا ہوتا تو اس کے ستارے کو دیکھتے تھے اور برجوں کی ہیئت اور فلک میں اس کی پوزیشن کے حساب سے اس کے مستقبل کی پیش گوئی کرتے تھے۔ کلدانی کواکب کی حرکات کے حساب سے چاند گرہن کا بھی پہلے سے پتا لگا لیتے تھے۔ کلدہ اور اشور کے آثار قدیمہ سے برآمد ہونے والی الواح جو ۳۰۰۰ ق م سے تعلق رکھتی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے باشندے اس قدیم عہد میں لکھنا جانتے تھے۔ [35]

فن تعمیر میں بھی ان کو کمال حاصل تھا۔ انھوں نے بڑے بڑے محل تعمیر کر رکھے تھے۔ ان کے بت خانے کئی کئی منزلہ اور مربع برجوں والے ہوتے تھے۔ وہ پیتل اور سونے چاندی کے خوب صورت مجسمے ڈھالتے اور پتھروں اور لکڑیوں پر تصویر بناتے تھے۔ دریائے فرات پر بند ھ باندھ کر انھوں نے خود کو اس کی طغیانی سے محفوظ کر لیا تھا۔ [36]

اہل شام بھی زمانہ قدیم میں ایک بڑی تجارتی قوم تھے اور پڑوسی ملکوں سے ان کے تجارتی تعلقات تھے۔ انھوں نے بڑی بڑی کشتیاں تیار کر رکھی تھیں۔ اور ان کے ذریعے سے ان کی بحری تجارت خوب زوروں پر تھی۔ بحری اسفار کے دوران قطب تارے کے ذریعے رہنمائی حاصل کرتے تھے اور بے خوف وخطر سمندروں میں دور تک چلے جاتے تھے۔ [37] انہیں موسیقی، مصوری، مجسمہ

سازی اور نقش و نگار کے فن سے بھی دلچسپی تھی۔ لیکن ان میں انہیں کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں تھی، بلکہ یہ فنون انھوں نے بابلی، اشوری اور مصری اقوام سے حاصل کئے تھے۔

قدیم زمانے میں اہل مصر بھی اعلیٰ وارفع تہذیب و تمدن کے مالک تھے۔ اس تمدن کو انھوں نے دوسری قوموں کی مدد سے نہیں اخذ کیا تھا بلکہ خود اپنی ذاتی کوششوں وے پروان چڑھایا تھا۔

اس تہذیب و تمدن کو ہیکسوس کے مصر پر قبضہ کرنے کے بعد بھی زوال نہیں آیا۔ اس لئے کہ انھوں نے فراعنہ کے نقش قدم کی پوری پیروی کی۔ ان کے عادات و اطوار، مذہب و انتظام ریاست ہر چیز کو اپنا لیا، ان کے رنگ میں رنگ گئے اور اس ملک کے بادشاہوں اور فراعنہ کے مثل بن گئے۔[38]

اہل مصر علم نجوم میں مہارت رکھتے تھے۔ زمین مسطح، ہوا خوشگوار اور مطلع صاف ہونے کی وجہ سے انھیں ستاروں کے حرکات میں غور کرنے کا موقع ملا۔ انھوں نے طویل تحقیقات کے بعد سورج کی گردش کے حساب سے سال کا اندازہ لگالیا تھا۔[39] مصر کی سب سے اہم چیز جس نے اسے شہرت و دوام عطا کی، وہ اس کے مقابر و ہیاکل ہیں، جنھیں اہرام کہا جاتا ہے۔ مصریوں کا عقیدہ تھا کہ روح ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ اس لیے انھوں نے اہرام کی شکل میں ایسے مقبرے بنائے، جو عرصہ دراز تک قائم رہ سکیں۔ یہ اہرام فن تعمیر میں اہل مصر کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں بڑی بڑی چٹانیں کاٹنے، تراشنے اور مطلوبہ شکل میں ڈھالنے کا فن آتا تھا۔ اسی طرح و مجسمہ سازی اور مصوری میں بھی مہارت رکھتے تھے۔[40] اہرام کے علاوہ مصر کے شاہی محل بھی مصریوں کے فن تعمیر کا خوب صورت نمونہ ہیں۔ انھوں نے پہاڑوں اور چٹانوں کو تراش کر زیر زمین مقبرے بھی بنا رکھے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جسم سے روح نکلنے کے کچھ عرصے بعد دوبارہ لوٹ کر آتی ہے۔ اس لیے انھوں نے جسم کو محفوظ کرنے کیلئے تحنیط (ممی بنانے) کا فن ایجاد کیا تھا۔ لاشیں حنوط لگانے کے بعد طویل عرصے تک محفوظ رہتی تھیں۔[41]

## مذہبی صورت حال:

اللہ تعالیٰ نے ان قوموں کو جس عیش و عشرت، خوش حالی، فارغ البالی اور تہذیب و تمدن کی ترقی سے نوازا تھا، اس کا تقاضہ تو یہ تھا کہ وہ ان نعمتوں پر اس کا شکر بجالاتیں، صرف اسی کی عبادت و بندگی کرتیں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتیں۔ لیکن ان قوموں کے حالات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بدترین قسم کے شرک میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ وہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں گھڑے ہوئے معبودوں کی پرستش کرتی تھیں۔ انھوں نے ان سابقہ اقوام کے انجام سے کوئی عبرت حاصل نہیں کی جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی پاداش میں ہلاک کر دی گئیں تھیں۔

اگر مذہب صابئیت کواکب اور نجوم پرستی سے عبارت ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانے میں یہ قومیں مذہب صابئیت اختیار کیے ہوئے تھیں۔ صابئیت سے ہماری مراد وہ اعتقادات نہیں ہیں جو بعد میں فلسفہ کے زیر اثر اس مذہب میں شامل ہوئے اور نہ وہ تبدیلیاں ہیں جن کی بناپر قدیم صابئیت اور جدید صابئیت میں بہت زیادہ فرق ہو گیا۔ بلکہ اگر ہم صابئیت کو تاریخی طور پر متعدد ادوار میں تقسیم کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس زمانے میں اپنے ابتدائی متوسط دور میں تھی۔[42]

شہرستانی نے لکھا ہے کہ:

"حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں صابئہ کے دو فرقے تھے۔ ایک اصحاب الھیاکل کہلاتا تھا اور دوسرا اصحاب الاشخاص۔ صابئہ کہتے تھے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے اوامر ونواہی کی معرفت کیلئے ایک واسطہ کی ضرورت ہے، لیکن ضروری ہے کہ یہ واسطہ روحانی ہو۔ اس لیے کہ روحانی واسطہ ہی پاکیزہ ہوتا ہے اور اسے رب الارباب سے تقرب حاصل رہتا ہے۔ پھر جب صابئہ خالص روحانیات پر اکتفا نہیں کر سکے تو ان میں سے ایک گروہ نے سات سیاروں اور بعض ثوابت (تاروں) کو ان کے ہیاکل مان لیے اور دوسرے گروہ نے بتوں کو ان کا مظہر قرار دیا۔ اس طرح پہلا گروہ کواکب پرستی میں اور دوسرا ابت پرستی میں مبتلا ہو گیا۔"[43]

اشوریوں اور کلدانیوں کے عقائد میں توحید کے اشارے بھی ملتے ہیں لیکن بہت جلد ان میں شرک، بت پرستی اور کواکب پرستی داخل ہو گئی۔ اس کا سبب خالص جغرافیائی تھا کہ ان کے یہاں بالعموم مطلع بالکل صاف اور بے ابر رہتا تھا اور رات میں ستارے خوب چمکتے تھے۔ اس بنا پر وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے پھر انھیں معلوم ہوا کہ بعض ستارے اپنی جگہ قائم اور بعض اپنی جگہ سے ہٹتے رہتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ثوابت اور سیاروں میں فرق کیا۔ اور سیاروں کو اپنے معبودوں کی خاص تجلی کا مقام اور ان کا ترجمان قرار دیا۔ انھوں نے ہر سیارے کو ایک معبود کا نمائندہ قرار دیا اور اسے اسی معبود کے نام سے موسوم کیا۔ پھر انھیں معلوم ہوا کہ سورج ہر روز ایک مقام سے نہیں نکلتا بلکہ اپنی جگہ سے ہٹتا رہتا ہے اور آسمان میں اس کا گردش جاری رہتا ہے اس بنا پر انھوں نے بارہ برج قرار دیے اور انھیں ارواح اور معبودوں کا مسکن قرار دیا۔[44]

کلدہ اور اشور کے تمام شہروں میں ابتدا میں مخصوص معبودوں کی پرستش کی جاتی تھی۔ ہر شہر کا خاص معبود تھا، جسے اس شہر کا مالک، محافظ اور رب تصور کیا جاتا تھا اور اس شہر کے باشندے دوسرے معبودوں کے مقابلے میں اس کا زیادہ احترام کرتے تھے، لیکن بعد میں تمام شہروں میں تمام معبودوں کی پرستش ہونے لگی۔ بیش تر معبود سیاروں، ستاروں اور اجرام سماوی سے تعلق رکھتے تھے۔ کچھ کا تعلق زمین سے تھا۔ بابل کی کھدائی میں نکلنے والے کتبات میں تقریباً پانچ ہزار بتوں کے نام ملتے ہیں۔[45]

اہل شام بھی ابتدا میں موحد تھے۔ وہ اپنے معبود کو "بعل" کہتے تھے جس کے معنی رب اور آقا کے ہیں۔ پھر وہ اپنے رب کو من چاہی صورتوں میں پیش کرنے لگے۔ ہر شہر کا ایک مخصوص رب قرار پایا۔ افلاک، نجوم اور دوسری قوتوں کو خدا بنالیا گیا۔ انھوں نے اپنے معبودں کی بیویاں اور دیویوں کے شوہر بنالیے تھے۔ رب الارباب کا مجسمہ انھوں نے ایسا تیار کیا تھا کہ اس کا اوپر کا نصف دھڑ انسان کا اور نچلا دھڑ مچھلی کا تھا۔ آرامی سورج، چاند، ساتوں سیاروں، ہوا، آگ وغیرہ کی پرستش کرتے تھے۔ کاہن سال کے مخصوص دنوں میں مذہبی تہوار منعقد کرتے تھے۔ ان میں رقص و سرور کی محفلیں جمتی تھیں۔ لڑکیوں اور قیدیوں کو ہیکلوں کے آستانوں پر بھینٹ چڑھایا جاتا تھا۔ ہیکل بدکاری اور رقبہ گری کے اڈے بنے ہوئے تھے۔[46]

مصریوں نے پہلے مظاہر فطرت اور اجرام سماوی (سورج، چاند، ستاروں) کی پرستش کی۔ اس کے بعد بت پرستی کی طرف مائل ہوئے۔ رولن نے کہا:

"مذہب کے معاملے میں مصری بہت بے وقوف اور احمق واقع ہوئے تھے۔ ان کے یہاں بتوں کی کثرت تھی۔ اور ان کے درمیان طبقات اور مراتب تھے۔ ان میں سب سے بڑے اوسرس یعنی سورج دیوتا اور اسس کا

ایزلیس یعنی چاند دیوتا تھے۔ ان کے پرستش تمام علاقوں میں عام تھی اس میں شک نہیں کہ بت پرستی کا ظہور انہی سیاروں کی پرستش کے نتیجے میں ہوا"[47]

اس کے بعد وہ ہر اس چیز کی پرستش کرنے لگے، جس سے انہیں کسی قدر منفعت یا ضرر کی امید ہوتی تھی۔ ان کے معبدوں میں دریائے نیل، آگ، بیل، بھیڑ، کتا، گھڑیال، نیولا، بلی اور دوسرے حیوانات، پرندے حتی کہ سبزیوں تک کے نام ملتے ہیں۔ رومی شاعر بوفنال ان کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتا ہے:

"اس قوم کے سادہ لوحی پہ قربان جایئے جس کے معبود کھیتوں میں اگتے تھے"[48]

ان کے معبودوں کی اتنی کثرت ہوگئی کہ ہر شہر اور ہر بستی کا ایک یا ایک سے زائد معبود ہو گئے تھے۔ چھوٹے معبودوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں تھا۔ ہر انسان کا ایک الگ خدا تھا۔ بلکہ معبودوں کی تعداد عابدوں سے بڑھ گئی تھی۔

بڑے بڑے معبودوں کیلئے انھوں نے ہیکل قائم کر رکھے تھے۔ ان میں قربانیاں پیش کی جاتی تھیں۔ ان ہیکلوں میں مذہبی مراسم ادا کرنے کیلئے دیوداسیوں کی خدمات حاصل تھیں۔[49]

**عصر حاضر کے سامی مذاہب:**

ان میں اسلام، عیسائیت اور یہودیت داخل ہیں دنیا کے ان تین بڑے مذاہب کے پیروکار مسلمان، عیسائی اور یہودی حضرت ابراہیمؑ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں بلکہ آپؑ سے انتساب کا شرف انہی مذاہب والوں کو حاصل ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اصلاً سامی النسل تھے بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل دونوں اولاد ابراہیم ہے۔ بنی اسرائیل حضرت ابراہیمؑ کی وہ اولاد ہیں جو ان کی بیوی حضرت سارہ کے بطن سے اور بنی اسماعیل آپؑ کی بیوی حضرت ہاجرہ کے بطن سے ہیں۔ یہودیت اور عیسائیت کے انبیاء بنی اسرائیل میں سے جبکہ پیغمبر اسلام بنی اسماعیل میں سے ہیں اور اسی وجہ سے ان تینوں کو سامی مذاہب کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ ان مذاہب اور خصوصاً اسلام کا عقیدہ صرف سامی نسل کے لوگوں تک محدود ہو یا سامی نسل کی برتری پر مبنی ہو بلکہ اسلام کی تعلیمات یہ ہیں۔ کہ ہر صاحب ایمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔

جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

"إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ"[50]

"مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں"۔

"أَلَالَافَضْلَ لِعَرَبِيّ عَلَى عَجَمِيّ وَلاَ لِعَجَمِيّ عَلَى عَرَبِيّ"[51]

"عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر فضیلت حاصل نہیں تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے"

اسلام کی تعلیم سامی نسل کی تخصیص یا برتری کے بجائے اصول مساوات کی آئینہ دار ہے۔ ان مذاہب کے سامی النسل ہونے کا منشا صرف اس قدر ہے کہ ان کا آغاز سامی اقوام میں ہوا۔ ورنہ! یہ تینوں سامی مذاہب آج عالمگیر اور دنیا کے ہر براعظم میں پائے جاتے ہیں اور ان میں عیسائیت اور اسلام دنیا کے ہر حصے میں آج بھی زبردست سیاسی طاقت ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ گذشتہ ڈیڑھ ہزار سال سے دنیا پر حکمران ہیں۔ اس طرح نسل انسانی کی تاریخ کے اہم اور بنیادی دور میں صرف سامی نسل ہی دنیا کی قیادت کرتی

رہی ہے۔ اس عالمی قیادت سے نیچے اتر کر بھی یہ بات نمایاں ہے کہ غیر سامی اقوام سامی اقوام کے بر خلاف کبھی اپنے مرکز سے باہر نمایاں اور بااثر نہیں رہیں۔ مشرق وسطیٰ کے علاقے یا افریقہ، یورپ اور نئی دنیا کے کسی علاقے میں کبھی ان کی عملداری نہیں رہی۔

یہودیت کے ماسوا مسیحیت اور اسلام کو موجودہ دور کے بعض محققین نے تبلیغی مذاہب کہا ہے۔[52]

لیکن علماء اسلام یہودیت کی طرح عیسائی مذہب کو بھی غیر تبلیغی مذاہب میں شمار کرتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں خود انجیل کی شہادت یہ ہے:

"عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ "میں صرف بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کی تلاش کرنے آیا ہوں"

نیز اپنے حواریوں سے فرمایا:

"تم غیر قوموں کے پاس نہ جانا اور نہ سامریوں کے شہر میں داخل ہونا بلکہ پہلے بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کی طرف جانا"[53]

پس ثابت ہوتا ہے کہ ابتدائی تاریخ کی رو سے عیسائی مذہب بھی تبلیغی مذہب نہیں لیکن اگر مذہب کی تعلیم اور ابتدائی تاریخ کی بجائے پیروان مذہب کا عملی رویہ دیکھنا دلیل ہو تو پھر دنیا کے تقریباً تمام مذاہب آج کل کم و بیش تبلیغی ہو گئے ہیں۔ لیکن اصلاً ماسوائے اسلام کے دیگر مذاہب غیر تبلیغی ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"يَاَيُّهَاالنَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا"[54]

"اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا ہوں"

مذہب اسلام کسی خاص علاقے یا نسل کے ساتھ ہرگز مختص نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہ مذہب ہر مسلمان کو بھائی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ زبان، رنگ و نسل کے امتیاز سے یہ مذہب بالکل مبرا ہے۔ حبشہ کا بلالؓ ہو، روم کا صہیبؓ یا فارس کا سلمانؓ، اسلام میں سب بھائی بھائی ہے۔

مذکورہ بحث سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ سامی مذاہب کا منبع اور سرچشمہ ایک ہے۔ ان کی ابتدائی مسکن اور زبانوں میں معمولی تفاوت ہے۔ اسی طرح ان کی تہذیب و تمدن میں بھی مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اتار چڑھاؤ آتا رہا۔ نسلی حوالے سے سامی قبائل کی ابتداء اگرچہ سام بن نوحؑ سے ہے لیکن مذہبی حوالے سے موجودہ سامی مذاہب اولادِ ابراہیمؑ ہی میں وارد ہوئے ہیں۔ چاہے یہودیت ہو، مسیحیت ہو یا اسلام۔ اسی وجہ سے آج کی اصطلاح میں ابراہیمی مذاہب بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن اتنا فرق ضرور ہے کہ یہودیت اور مسیحیت نسلی مذاہب تھی۔ جبکہ اسلام بلا تفریق رنگ و نسل، روئے زمین پر رہنے والے تمام انسانوں کے لئے ہیں اور تا قیامت یہی مذہب انسانیت کے لئے راہنما ہے۔

**حواشی وحوالہ جات:**

[1]۔ کتاب پیدائش، ۱۲:۷، ۲۱:۱۰، ۱۱:۱۱۔

[2]۔ ڈاکٹر علی عبد الواحد وافی، فقہ اللغۃ ۲ الطبعۃ الثالثۃ، ۲۰۰۴ء، مکتبہ دار نہض مصر، ص: ۰ / ۰۔

[3]۔ پورانام August Ludwig von Schlozer 1735ء میں پیدائش اور 1809ء میں وفات ہوئی، مشہور جرمن تاریخ دان تھے آپ کے آباء اجداد پروٹسٹنٹ پادری تھے اسی وجہ سے Witternburg سے دینیات کی تعلیم حاصل کی، تکمیل کے بعد کئی مشہور جامعات میں تدریسی خدمات انجام دیں، اور سویڈش رائل اکیڈمی آف سائنسز کے عضو منتخب کیے گئے،

The Encyclopedia of Christian civilization published online:(25th Nov 2011. Accessed on: 22nd Dec 2016. www.onlinelibrary.wiley.com)

4۔ Ludwig von Schlozer، تحقیقات حول تاریخ الامم الماضیۃ، الطبعۃ 1781ء، Eichhorns Reportorum, Bd 8 p:161

5۔ پورا نام Albert Echhorn ہے، 1856ء کو پیدا ہوئے اور 1926ء کو وفات پا گئے، عہد نامہ Das Abendmahl im Neuen کے مصنف اور History of Religions School کے موجد تھے، یہی وہ منہج فکر ہے جس میں عیسائیت اور یہودیت سمیت تمام ادیان کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔(موسوعہ المستشرقین، ص:۲۳)

6۔ Die Semitischen Sprachen

7۔ بائبل عہد نامہ عتیق، کتاب پیدائش، باب ۱۰۔

8۔ سفر التکوین، الاصحاح، ۱۰۔

9۔ بائبل، پیدائش، ۱۱۔

10۔ ارنسٹ رینان ایک مشہور فلسفی تھا، فرانس کے علاقے ٹریجہ میں ۱۸۲۳ء کو پیدا ہوئے جبکہ ۱۸۹۲ء کو بیروت میں وفات پا گئے، ابتدائی تعلیم مذہبی درسگاہوں میں حاصل کی، پھر مشرقی زبانیں سیکھی، اور ان میں اتھارٹی کی حیثیت حاصل کی، آبائی وطن سے رحلت کر کے بیروت آکر آباد ہوئے، عقائد اسلامیہ بھی دلچسپی کا موضوع بنا رہا، ۱۸۷۸ء کو فرنچ اکیڈمی کے عضو بن گئے، ۸۷ کتابیں تصنیف کیں، جن میں اہم 'تاریخ اللغات السامیۃ' اور 'تاریخ الادیان' ہے۔ موسوعہ المستشرقین، ص:۱/۲۰۲۔۲۰۳( الدکتور محمد التونجی، المعجم المفصل فی الادب، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ص:۲/۳۔۵)۔

11۔ بروکلیمن ایک مشہور زمانہ جرمن مستشرق تھے، جرمنی شہر روستوک سے تعلق تھا، ۱۸۶۸ء کو پیدا ہوئے اور ۱۹۵۶ میں وفات پائی، وقت کے مشہور مستشرقین سے سامی زبانیں سیکھ کر ان میں مہارت حاصل کی، اور عربی زبان و علوم میں طاق ہوئے، آپ کے قلم سے مشہور زمانہ کتاب 'تاریخ الادب العربی' کے ساتھ ساتھ بے شمار کتابیں نکلیں۔ المستشرقین، ص: ۲/۷۷(الزرکلی، الاعلام، دار العلم للملایین، بیروت، ص: ۵/۲۱۱)۔

12۔ ڈاکٹر علی عبد الواحد وافی، فقہ اللغۃ، ۴۔

13۔ اسرائیل ولفسنون، تاریخ اللغات السامیۃ، باب ثانی، ص:۲۲۔۲۵۔ أیضا: Perrot op, Cit,28۔

14۔ المعارف، ابن قتیبہ، کارخانہ تجارت کتب، کراچی، ص:۱۳۔

15۔ جرجی زیدان، العرب قبل الاسلام، ص:۱/۴۰۔

16۔ کرد، محمد علی، خطط الشام، الطبعۃ ۱۸۹۹ء، مکتبہ النوری دمشق، ص:۱/۲۰۔

17۔ خطط الشام، ص:۱/۱۸۔

18۔ العرب قبل الاسلام ص:۱/۵۲۔

19۔ پوپ مرمرجی ڈومینکی، ھل العربیۃ منطقیۃ؟، ابحاث ثنائیۃ ألسنیۃ، ص:۱۴۵۔۱۵۰۔

20۔ بلاد اکاد، قدیم شہر کا نام ہے، ایک قول کے مطابق نمرود نے اس کو آباد کیا تھا، اس کا محل وقوع یقینی طور معلوم نہیں، لیکن بعض ترجیحی آراء کی بناء پر یہ شہر دریائے دجلہ کے مشرقی ساحل پر آباد تھا، کتاب مقدس کے باب "سفر تکوین" میں اس کا ذکر آیا ہے۔ دکتور رمضان عبد التواب، فصول فی فقہ العربیۃ، مکتبہ الخانجی، القاہرہ، ص:۲۶۔

[21]۔ اسرائیل ولفنسون، تاریخ اللغات السامیۃ، باب ثانی، ص:۲۲۔۲۵، ایضاً Perrot op, cit,28

[22]۔ ایضاً، ص:۲۲۔۲۵۔

[23]۔ بلاد مؤاب بحر مردار کے جنوب مشرق میں واقع ہیں۔

[24]۔ ماہرین آثار قدیمہ نے اس نقش کو سن ۱۸۶۸ء کو دریافت کیا تھا، جواب پیرس 'لوور' عجائب کی زینت بنی ہے۔۔

[25]۔ کنعانی بولیوں سے متعلق مزید معلومات کے لئے، ولفنسون کی کتاب، ص:۵۱۔۱۱۳۔ ڈاکٹر علی عبد الواحد وافی، فقہ اللغۃ، ص:۳۰۔۵۱

[26]۔ اسرائیل الفنسون، تاریخ اللغات السامیۃ، ص:۱۱۷، ملاحظہ ہو:Les langoes arameenns

[27]۔ ڈاکٹر علی عبد الواحد وافی، فقہ اللغۃ، ص:۱۷۔۴۳، ولفنسون، ص:۱۷۵۔۱۹۴۔

[28]۔ ابن منظور، لسان العرب، مادہ، باد (ض)، ج۳، ص۹۷، ط دار صادر بیروت، ۱۴۱۴ھ۔

[29]۔ اسرائیل ولفنسون، تاریخ اللغات السامیۃ، ص:۱۶۲۔

[30]۔ تحقیقات لتمن( Somitic Inscription: P, 115-119،Litmann)

[31]۔ مشہور جرمن مستشرق تھا، 1875 میں پیدائش اور 1956 میں وفات ہوئی، مجمع علمی عربی دمشق اور مجمع اللغۃ المصریہ کے اعضاء میں سے تھے، چند یورپی تحقیقی اداروں سے بھی منسلک رہے، ہالہ یونیورسٹی سے 1898ء میں پی ایچ ڈی کی تکمیل کی، عربی، حبشی، عبرانی، سریانی، فارسی اور ترکی زبانوں پر دسترس حاصل تھی مختلف جامعات میں تدریسی خدمات انجام دیں، ۲۰۰ سے زائد تحقیقی مقالات مختلف موضوعات میں پیش کی، جن میں چند اہم مندرجہ ذیل ہیں :

اللہجات العربیۃ القدمیۃ الصفویۃ والثمودیۃ اور اللہجات العربیۃ الشمالیۃ قبل الاسلام۔ الاعلام، الزرکلی، دار العلم للملایین، بیروت، ص:۲/۳۶۔

[32]۔ اسرائیل ولفنسون، ص:۱۸۹، ڈاکٹر علی عبد الواحد وافی، فقہ اللغۃ، ص : ۱۰۱۔

[33]۔ اسرائیل ولفنسون، ص:۱۷۸۔

[34]۔ جواد علی، المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، ساعدت جامعۃ بغداد علی نشرہ، ص:۱/ ۵۴۵۔۵۴۶۔

[35]۔ سینوس فرانسیبی، (مترجم اردو، سید محمود اعظم فہمی) مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ۱۹۲۱ء، تاریخ ملل قدیمہ، ص:۹۴۔۹۵، ۱۷۳۔

[36]۔ ایضاً: ص:۱۶۸۔۱۶۹، (التاریخ القدیم: ص:۹۸)۔

[37]۔ خطط الشام، کرد علی، ص:۵/ ۳۲۔۳۳۔

[38]۔ اصمعی، عمر عبد الجواد، العرب واطوار ھم، طور العرب والعربیۃ فی اطوار الجاہلیۃ، ۱۹۱۲ء، مطبع الجمالیۃ القاہرہ، ص:۱/ ۲۱۔۲۲۔

[39]۔ رولن(The Ancient History of the Egyptians, P.59, 1850 Edinburgh)

[40]۔ والس برج، سواء السبیل فی سکان ارض النیل، مطبعۃ الامریکان، بیروت ص:۱۲۶۔۱۲۷)۔

[41]۔ ایضاً، ص:۱۰۴۔۱۰۵۔

[42]۔ حسنی، استاد عبد الرزاق، الصابئہ قدیماً وحدیثاً، المطبعۃ الرحمانیۃ، مصر، ص:۲۰۔۲۱۔

[43]۔ شہرستانی، ابو الفتح محمد بن عبد الکریم، الملل والنحل تحقیق: فتح اللہ بدران، مکتبہ الانجلو المصریۃ القاہرۃ، ص:۲/ ۲۷۔

[44]۔ تاریخ ملل قدیمہ، ص:۱۵۷۔

[45]۔ تاریخ ملل قدیمہ، ص:۱۵۴۔۱۵۵، تاریخ ارض القرآن۔ سید سلیمان ندوی، ص:۲/۱۵۴۔۱۵۵۔

[46]۔ خطط الشام، ص:٦/ ٢٠٥۔٢٠٦۔

[47]۔ طبوزادہ، الدکتورہ، زکیہ یوسف، مراجعہ، الدکتور محمد ابراہیم علی، تاریخ مصر القدیم، القاہرہ، ٢٠٠٨ء، ص:۴۵۔

[48]۔ ضیاء الدین اکمل، تاریخ قدیم، بک فورٹ، ریسرچ اینڈ پبلیشنز، ہاؤس نمبر ۹، سٹریٹ نمبر ۳۲، غنی محلہ، سنت نگر، لاہور۔

[49]۔ طلعت رضوان، معجم الحضارۃ المصریۃ، مجموعہ علماء، مکتبہ الاسرۃ، ١٩٩٦ء، ص:٦٥۔

[50]۔ سورۃ الحجرات:١٠۔

[51]۔ ابن حنبل، ابوعبداللہ احمد بن محمد، مسند احمد، موسسۃ الرسالۃ، الطبعۃ الاول، ٢٠٠١ء، ص:۵/ ۱۴۴۔

[52]۔ پروفیسر میکس میلر، ایک مشہور مستشرق ہے اور ینٹل مذاہب اور روایات کے دریافت کرنے کے لئے اہم کردار ادا کیا، انیسویں صدی میں تقابل ادیان پر کام کیا۔ ۱۸۲۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۰ء میں وفات ہوئے۔

[53]۔ بائبل، متی، ٦،۵:١٠۔

[54]۔ سورۃ الاعراف:١٥٨۔